ڈاکٹر مظفّر عبّاس

فرحت اللہ بیگ اور دلّی کی آخری شمع

میرزا فرحت اللہ بیگ نے مضمون نگاری کا آغاز "مرزا الم نشرح" کے قلمی نام سے کیا۔[1] فرحت اللہ بیگ کے نام سے اُن کا پہلا مضمون "نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی" کے عنوان سے رسالہ "اردو دکن" کے جولائی ۱۹۲۷ء کے شمارے میں چھپا۔ اُنھوں نے پہلا مضمون اپنے زمانۂ طالب علمی میں "بڑی بوڑھیوں سے سنیے، غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات" کے عنوان سے لکھا تھا جو کہیں شائع ہوئے بغیر ضائع ہوگیا۔ اپنے اس پہلے مضمون کے بارے میں فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے۔

"ہم بی۔ اے۔ میں پڑھتے تھے کہ کیمبرج سے غدر کے متعلق ایک جواب مضمون پر انعام مقرر ہوا۔ اس مضمون کے لیے شرط یہ قائم کی گئی تھی کہ کوئی واقعہ تاریخی کتاب سے نہ لیا جائے، جو لکھا جائے شہر کے بڈھے بوڑھیوں سے دریافت کرکے لکھا جائے۔ میں نے بھی یہ مضمون لکھا اور مجھ ہی کو یہ انعام ملا۔۔۔ اب وہ مضمون دریا بُرد نہیں تو دریا پار ضرور ہوگیا۔ مسودہ نہ رکھا اور نہ رکھنے کی عادت ہے، اس لیے اب اس کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔"[2]

فرحت اللہ بیگ کے مندرجہ بالا بیان سے ہم بآسانی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سن ستاون کی جنگِ آزادی کے حالات و واقعات ابتدا ہی سے اُن کی فکر کا محور رہے۔ مرزا دہلی والے تھے اور دہلی کی تباہی اُن کے لیے زندگی کا اہم ترین تجربہ بن کر اُبھرتی ہے، ایک ایسا تجربہ جس کے خمیر سے فرحت اللہ بیگ کی ادبی شخصیت کی اُٹھان ہوئی۔

۱ے مضامینِ فرحت، حصّہ اوّل (طبع دکن، ۱۹۴۴ء) ص: ۷، ۸۹۔
صفحہ نمبر ۷ پر یہ عبارت ہے ——— "بنام اُدکہ نام او ندارد ——— مرزا الم نشرح"۔

۲ے دہلی کی آخری شمع۔

" دہلی کی آخری شمع " فرحت اللہ بیگ کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے ۔ خواجہ حسن نظامی کی اس رائے سے جو اس مضمون کے بارے میں سب سے پہلی تنقیدی رائے ہے ، ہم اس کی اہمیت وافادیت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں ۔

"چوٹ کھایا ہوا دل خود ہی سمجھ لے گا کہ میرزا فرحت اللہ نے دہلی کی اس شمع کی زیارت کرادی ہے جو مسلمانوں کی گزشتہ رات کو محفل کی رونق کو بڑھا رہی تھی اور مرنے والی قوم کی مٹنے والی تہذیب کو دکھا رہی تھی اور جس نے صبح کے قریب روتے روتے ہچکیاں لیتے لیتے ایک آہ کی تھی اور ایک آہ کے ساتھ اس کا شعلہ بجھ کر اور دھواں بن کر اُڑ گیا تھا ۔"۵۳

دہلی کا اُجڑنا محض ایک تاریخی واقعہ نہیں ہے ۔ یہ حقیقتاً برعظیم کے مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ کا ایک عظیم سانحہ ہے ۔ اس واقعے سے سیاسی طور پر تو صرف اتنی تبدیلی ہوئی کہ اقتدارِ اعلیٰ مسلمانوں سے انگریزوں کو منتقل ہو گیا مگر فی الواقعہ اس سے مسلمانوں پر ایک ضربِ کاری لگی ۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی کے اُجڑنے کی داستان ہماری شاعری اور ادب کا اہم اور مستقل موضوع بن گئی ہے ، اور ہمارے شعرا اور ادیب اس المیے پر خون کے آنسو روتے نظر آتے ہیں ۔ خواجہ حسن نظامی کی نثر اور غالب کے خطوط اور اشعار اس سلسلے کی نمایاں مثالیں ہیں کہ جن میں دہلی کی تباہی کے بارے میں مسلمانوں کے تہذیبی زوال کی الم ناک داستان کی تفصیلات ملتی ہیں ۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی کہ ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

(میرؔ)

دہلی کی تباہی تہذیبی المیے کے ساتھ ساتھ مقامِ عبرت بھی ہے ۔ خواجہ حسن نظامی نے

---

۵۳ دہلی کی آخری شمع، (طبع اوّل ، دہلی) ص: ۴

درست کہا ہے۔

"سدا رہے نام اللہ کا۔ دُنیا کے طلسم خانے میں کون رہا ہے جو دلّی کی شان رہ جاتی اور کون جانتا ہے کہ دلّی اجڑنے کے بعد لندن کی آبادی نمودار ہوئی تو یہ آبادی کب تک قائم رہے گی اور کون سا انگریز حسن نظامی کی طرح ٹیمز دریا کے کنارے بیٹھ کر لندن کی ختم شدہ شان کے افسانے لکھا کرے گا"[۵۴]

فرحت اللہ بیگ نے اسی المیے کی جھلک اپنے مضمون "دہلی کی آخری شمع" میں دکھائی ہے۔ یہ مضمون سب سے پہلے رسالہ "اُردو"، دکن کے اکتوبر ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع ہوا[۵۵] اس کے بعد یہ رسالہ "الناظر" لکھنؤ اور پھر "مضامین فرحت" میں شائع ہوا۔[۵۶]

کتابی صورت میں پہلی مرتبہ اس مضمون کو خواجہ حسن نظامی نے دلّی سے شائع کیا[۵۷] اشاعتِ اوّل کی کہانی خواجہ حسن نظامی نے یوں بیان کی ہے۔

---

۵۴ ایضاً دیباچہ ص ۱۰

۵۵ مضمون رسالے کے صفحات ۵۸۱ تا ۶۶۱ پر مشتمل ہے۔ عنوان کے نیچے مصنف کا نام یوں درج ہے ——— "از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی۔ اے۔ دہلوی"

۵۶ حسن نظامی، دیباچہ، دہلی کی آخری شمع، (طبع اوّل) ص ۲۰

۵۷ بڑے سائز کے سو صفحات پر مشتمل اشاعت اوّل کے سرورق کے اس نمونے سے کتاب کی اشاعت کے بارے میں تمام معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

۷۸۶ هوالکل یامعین

غدرِ دہلی کے افسانوں کا

گیارھواں حصّہ

دہلی کی

آخری شمع

از جناب میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے

مصنف کی اجازت سے شائع کیا

(باقی اگلے صفحہ پر)

"وہ مضمون میرے دوست ملّا واحدی صاحب، ایڈیٹر رسالہ "نظام المشائخ" دہلی نے سب سے پہلے دیکھا اور چونکہ ان کا خاندان شاہجہان بادشاہ کے زمانے سے دہلی میں ہے اور اس کے تعلقات قلعے سے ہمیشہ رہے تھے، اس لیے ان پر دہلی کے اس مشاعرے نے بڑا اثر کیا اور میں نے اُن کے کہنے سے تمام و کمال مضمون پڑھا حالانکہ آج کل کام کی کثرت کے سبب اکثر مضامین کے مطالعے سے محروم رہتا ہوں۔ جب میں نے اس کو پڑھا تو فوراً انگریزی اخبار "ینگ مسلم" دہلی کے ایڈیٹر صاحب سے کہا کہ اس مضمون کا ترجمہ کیجیے تاکہ یورپ و امریکہ کو بھی دہلی کی آخری شمع کی روشنی نظر آسکے۔ اس کے بعد میں نے میرزا فرحت صاحب کو اپنے عزیز دوست مولوی مظہر اللہ نظامی کے ذریعے خط لکھا کہ وہ مجھ کو یہ مضمون بصورتِ کتاب شائع کرنے کی اجازت دیں۔ میرزا صاحب نے جواب دیا اور ایسا جواب جس سے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ وہ میری خواہش کے قدردان ہیں۔ میں نے اس مضمون کا نام "دہلی کی آخری شمع" مشاعرہ کی رعایت سے رکھ دیا اور چھپوانے کی تیاری ہونے لگی۔"[۵۸]

مئی ۱۹۲۸ء میں اشاعتِ اوّل کے بعد خواجہ حسن نظامی نے اپنے ادارے کی جانب سے اس کے سات ایڈیشن شائع کیے جن کی تفصیل یہ ہے:

طبع دوم	۱۹۳۶ء
طبع سوم	۱۹۳۸ء
طبع چہارم	۱۹۴۰ء
طبع پنجم	۱۹۴۴ء
طبع ہفتم	۱۹۴۹ء[۵۹]

(بقیہ گزشتہ صفحے سے)

اور

ابنِ عربی کارکن حلقۂ مشائخ دہلی نے بماہ مئی ۱۹۲۸ء

پہلی بار ریاست برقی پریس دہلی میں چھپوایا ـــــــ قیمت عہ

۵۸ دہلی کی آخری شمع (طبع اوّل) دیباچہ، ص: ۲-۳
۵۹ طبع ششم کے بارے میں تفصیل نہیں ملتی۔

قیام پاکستان کے بعد انجمن حمایت اسلام لاہور، اور اُردو مرکز[۱۰] نے بھی یہ کتاب شائع کی، اور اس کے بعد تواتر کے ساتھ اس کی اشاعت ہو رہی ہے ۔

طباعت کی تفصیلات کے بعد اب کتاب کے نفس مضمون کی جانب آیئے ۔ اس مضمون کی بنیاد دہلی کی تہذیب کی عکاسی ہے جو اُس دور میں مسلمانوں کی تہذیب کا استعارہ تھی، اور اس کا اُجڑنا درحقیقت مسلمانوں کی تہذیب کا زوال ہے ۔ غالب نے اپنے ایک خط میں اس طرف واضح اشارہ کیا ۔ ایک مثال دیکھیے ۔

" بھائی کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں ۔ دلّی کی ہستی منحصر ہی ہنگاموں پر ہے ۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلّی کہاں ۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا ۔

(بنام میر مہدی حسن مجروح : اُردوئے معلّٰی)

قلعہ معلّٰی کے ہنگاموں میں مشاعرہ خاص اہمیت کا حامل تھا ۔ اس ادارے سے ہماری تہذیبی روایات وابستہ تھیں ۔ اردو تنقید کے ابتدائی نقوش ان ہی مشاعروں میں ظاہر ہوئے اور بقول کلیم الدین احمد —— مشاعروں کی 'آہ' اور 'واہ' ہی ہماری تنقید کی تاریخ کا نکتۂ آغاز ہیں ۔ علمی اہمیت کے علاوہ مشاعرے تہذیبی روّیوں کے مظہر بھی تھے، اور تہذیب کے زوال کے ساتھ ساتھ اس اہم ادارے کو بھی زوال ہوا ۔ چنانچہ فرحت اللّٰہ بیگ کا یہ مضمون اسی زوال کی داستان دہراتا ہے ۔ اس مضمون کے بارے میں مولوی عبدالحق کی یہ رائے انتہائی وقیع اور حوالے کے قابل ہے ۔

" دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" ایک معرکے کا مضمون ہے ۔ اس میں تاریخی شان پائی جاتی ہے اور مرزا صاحب نے اسے اپنے خاص رنگ میں بیان کیا ہے، جس کا جیسا مزاج، ویسا ہی اسلوب بیان ۔ ٹھیٹ دلّی کی زبان، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نہیں پڑھ رہے، سچ مچ کا مشاعرہ دیکھ رہے ہیں ۔"[۱۱]

---

[۱۰] اُردو مرکز نے "دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" کے نام سے ۱۹۶۰ء میں شائع کی ۔

[۱۱] فلیپ، دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ (مطبوعہ اُردو اکیڈمی سندھ ۱۹۷۰)

مضمون کے پانچ حصّے بنائے گئے ہیں ۔ تمہید، تدبیر، ترتیب، تکمیل اور تقدیر ۔ پہلے حصّے میں مضمون لکھنے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے میرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے ۔

" جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں ۔ اتفاق دیکھیے کہ پرانے قدیم کاغذات میں مجھ کو حکیم مومن خاں مومن دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی ۔ تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی محمد حسین آزاد مرحوم کے " نیرنگِ خیال " کی محفلِ شعرا کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر ۔ مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کی بجائے صرف ان کی چلتی پھرتی تصویر ہی دکھا ۔ خیال میں رفتہ رفتہ پختگی ہوئی اور اس پختگیٔ خیال نے ایک مشاعرہ کا " خاکہ پیش کر دیا " [۱۲]

اس مضمون کے لکھنے کا بنیادی مقصد میرزا فرحت اللہ بیگ کے نزدیک یہ تھا ۔

" زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا ۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ان کاملینِ فن میں سے بہت سے ملکِ عدم کو سدھارے، جو بچے کھچے رہ گئے تھے، اُن کو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا ۔ جس کو جہاں کچھ سہارا ملا وہیں کا ہو رہا ۔ دہلی برباد ہو کر حیدر آباد اور رام پور آباد ہوئے ۔ اکثر شرفا گھروں سے ایسے نکلے کہ پھر اُن کو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی ۔ جو رہ گئے ہیں وہ چلنے چلانے کو تیار بیٹھے ہیں ۔ بہت سے اُٹھ گئے، بہت سے اُٹھتے جاتے ہیں اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ کوئی یہ بتانے والا نہ رہے گا کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا ۔ جس طرح سوائے میرے اب شاید کسی کو معلوم نہیں کہ اُن کی قبر کہاں ہے ۔ ان حالات کو دیکھ کر مجھے خیال آیا (اس خیال کا محرک مومن مرحوم کی تصویر بھی ہوئی) کہ اردو کے لیے ان سے ایک ایسا چراغ روشن کروں جس کی روشنی میں آنے والی نسلیں زبانِ اردو کے محسنوں کی شکلیں (خواہ دھندلی ہی کیوں نہ سہی) اور ان کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم ان صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے ۔ [۱۳]

---

[۱۲] دہلی کی آخری شمع (طبع اوّل) ص: ۶ و ۷

[۱۳] ایضاً ص: ۵، ۶

اس مضمون کا بنیادی ماخذ مولوی کریم الدّین کا تذکرہ " طبقات الشعرا" ہے۔ یہ " آبِ حیات" سے پہلے کا تذکرہ ہے اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے قول کے مطابق :

" اردو شاعری کی تاریخ کی باقاعدہ تدوین کا پہلا قدم ہے۔" ۱۴ھ

مولوی کریم الدین نے یہ تذکرہ ۱۸۴۸ء میں گارساں دتاسی کے تذکرے کو بنیاد بنا کر لکھا تھا لیکن دتاسی کے تذکرے کے برعکس، یہ ایک باقاعدہ تذکرہ ہے جس میں ہجری اور عیسوی سنین کا التزام دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شعرا کے ادوار اور طبقات بھی بنائے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ نے اس تذکرے کے طبقۂ چہارم کو بنیاد بنا کر اپنا یہ ڈرامائی مضمون تیار کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :

" نیرنگِ خیال" نے دل میں مشاعرے کا خیال ڈالا، اُدھر کریم الدّین مغفور کی کتاب " طبقات الشعرائے ہند" کے طبقۂ چہارم نے رجب ۱۲۶۱ ہجری کے ایک مشاعرے کا پتا دیا، اب کیا تھا، دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا، رہی رنگ آمیزی، اس کی تکمیل میں خود کر دیتا ہوں۔" ۱۵ھ

فرحت اللہ بیگ کے اس مضمون کا ماخذ انتہائی معتبر تذکرہ ہے۔ لیکن رنگ آمیزی اُن کی اپنی ہے جس کی طرف اُنھوں نے خود اشارہ بھی کیا ہے اور یہی رنگ آمیزی اس مضمون کا نمایاں وصف ہے۔ میرزا صاحب نے اس مضمون میں شاعری کا احوال کریم الدین ہی کی زبانی بیان کیا ہے۔ مضمون کی ابتدا اس جملے سے کرتے ہیں :

لیجیے ! اب مولوی کریم الدین صاحب کی جون میں حاضرِ خدمت ہوں۔" ۱۶ھ مضمون کا آغاز غالب کے اس برمحل شعر سے ہوتا ہے ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

۱۴ھ شعرائے اُردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ص: ۷۰ - ۷۱

۱۵ھ دہلی کی آخری شمع، ص: ۸

۱۶ھ ایضاً، ص: ۹

اس کے بعد کریم الدین کا تعارف کرتے ہیں اور ان کی زبانی اس مشاعرے کے انعقاد کی وجہ اور پھر تیاریوں کا مفصّل تذکرہ کرتے ہیں۔

اس مضمون کے ذریعے میرزا مشاعرے کی تہذیبی روایت کو جدید دور میں زندہ کرنا چاہتے تھے۔ مضمون تخیلی انداز میں لکھا گیا اور خود مرزا نے بھی 'نیرنگِ خیال' کے تتبّع کا اقرار کیا ہے۔ اس مخصوص انداز ہی کی بنا پر اس مضمون کو انتہائی مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ اشاعت کے فوراً ہی بعد اسے شہرت عام کا درجہ حاصل ہوگیا، اور ۲۷-۱۹۲۶ء میں اسے اورنگ آباد کالج دکن میں مولوی عبدالحق کی نگرانی میں سٹیج کیا گیا۔ اُس وقت سے آج تک یہ متعدد بار سٹیج کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مضمون میں تمام ڈرامائی لوازم موجود ہیں۔ اور مرزا نے مرقع نگاری اس انداز سے کی ہے کہ شعرا کی جیتی جاگتی تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ جزئیات نگاری کا یہ عالم ہے کہ محفل کا معمولی سے معمولی پہلو بھی نظر سے اوجھل نہیں رہتا مشاعرے کے آغاز کا حال جزئیات نگاری کی عمدہ مثال ہے۔

"میرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوب دار سامنے کھڑے تھے، دونوں شمعیں اُٹھا کر اُن کے سامنے لائے۔ اُنھوں نے بسم اللہ کہہ کر فانوس اتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیے۔ چوبداروں نے شمعیں لے کر لگنوں میں رکھ دیں اور سیدھے کھڑے ہو کر میرزا فخرو کی طرف دیکھا، اُنھوں نے گردن سے اشارہ کیا، اشارہ پاتے ہی دونوں چوب داروں نے باآواز بلند کہا۔ حضرات مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔ اس آواز کا سننا تھا کہ ایک سناٹا ہوگیا۔ قلعے والوں نے بٹیریں تھیلوں میں بند کر، تکیوں کے پیچھے رکھ دیں۔ نوکروں نے جھٹ پٹ حقّے سامنے سے ہٹا دیے اور ان کی جگہ سب کے سامنے اگالدان، خاصدان، پن ڈبے کی طشتریاں رکھ اپنی اپنی جگہ جا کھڑے ہوئے۔" [۱۷]

مرقع نگاری کے سلسلے میں مرزا داغ کی یہ تصویر اُن کے فن کی بلندی کی علامت ہے:

"میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی، رنگت تو بہت کالی مگر چہرے پر غضب کی نمک، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی،

---

[۱۷] دہلی کی آخری شمع، ص: ۴۹

سر پر مخمل کی لیس لگی ہدنی چوگوشیہ ٹوپی، جسم میں ساسنلیٹ کا انگرکھا، سبز گلبدنی کا پیجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال، ہیں تو ابھی نوعمر، مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ"۔[۱۸]

مشاعرے کی تیاریوں کے سلسلے میں مولوی کریم الدین کے مکان کی آرائش و زیبائش کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں :

"چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی، جس کی وجہ سے در و دیوار پڑے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہوگئے تھے۔ تختوں پر دری، چاندنی کا فرش، اس پر قالینوں کا حاشیہ، پیچھے گاؤ تکیوں کی قطاریں۔ جھاڑوں، فانوسوں، ہانڈیوں، دیوارگیریوں، قمقموں، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا، جو چیز تھی خوبصورت اور جو شے تھی قرینے سے"۔[۱۹]

مرقع نگاری کے ساتھ ساتھ مضمون میں جا بجا شعرا کے کلام پر رائے زنی کی گئی ہے اور اس ضمن میں یہ مضمون تنقیدِ شعر کے بارے میں بھی اہمیت کا حامل ہے۔ مرزا کی آرا انتہائی وقیع ہیں۔ مولوی کریم الدین کی آرا کو مدِ نظر رکھنے کے علاوہ کہیں کہیں فرحت اللہ بیگ نے اپنا نقطۂ نظر بھی بیان کیا ہے۔ مرزا داغ کے کلام پر یوں تبصرہ کیا ہے۔

"آزردہ جیسے استاد کے بعد داغ کا پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے مگر بات یہ ہے کہ اوّل تو داغ کو سب چاہتے ہیں، دل بڑھاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا۔ دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے ان کو استادوں میں جگہ ملی تھی مگر انھوں نے غزل ہی ایسی پڑھی کہ استاد بھی قائل ہوگئے ۱۷۔۱۸ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی کمال ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے، وہ شاید ہی کسی کو نصیب

۱۸؎ دلّی کی آخری شمع، ص: ۴۷

۱۹؎ ایضاً، ص ۳۴

ہوگی ۔ ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجیے اور داد دیجیے ۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں [۲۰]

مضمون میں "داد" کے ساتھ "بے داد" بھی ہے ۔ منشی محمود جان اوؔج کی غزل پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے :

" اُن کی غزل میں دو ہی شعر ایسے تھے جن کی تھوڑی بہت تعریف ہوئی، باقی تو سب بھرتی کے تھے " [۲۱]

دو آرا اور ملاحظہ ہوں :

" میاں تجلیؔ پڑھ چکے تو حکیم سکھا نند رقمؔ کی باری آئی ۔ ان کو میں حکیم مومن خاں مومنؔ کے مکان پر دیکھ چکا تھا، کلام تو ایسا اچھا نہیں تھا مگر پڑھتے خوب ہیں ۔ یہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی اور اُنھوں نے سلام کا تار باندھا " [۲۲]

" شمع کا شیخ نیاز احمد جوشؔ کے سامنے جانا تھا کہ شاگردانِ ذوقؔ سنبھل کر بیٹھے ۔ جوشؔ کو استاد ذوقؔ بہت عزیز رکھتے ہیں ۔ ان کی عمر تو ۱۸ ۔ ۱۹ سال کی ہے، مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں ۔ اُن کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے ۔ مگر مشاعرے میں اُنھوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے کچھ پسند نہ آئی ۔ ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اُٹھا لیا ۔ استاد ذوقؔ نے بھی سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کر شاگرد کا دل بڑھایا ۔ غزل دیکھ لیجیے ممکن ہے کہ میں نے غلط اندازہ لگایا ہو ۔

کیونکر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں
بے درد کیسے بے اک آہ سو اس میں اثر نہیں

---

[۲۰] دلّی کی آخری شمع، ص : ۹۴
[۲۱] ایضاً ، ص : ۶۱
[۲۲] ایضاً ، (طبع اوّل) ص : ۶۳

آپ نے غزل ملاحظہ کر لی - میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شعر ایسا نہیں جو تعریف کے قابل ہو - اب زبردستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے "۔ ۲۳ء

اس قسم کی تنقیدی آرا مضمون میں جا بجا ملتی ہیں جو اس کتاب کی تنقیدی اہمیت کی غماز ہیں -

اب ایک آخری بات اسلوب کے بارے میں ــــــــــ

فرحت اللہ بیگ مولوی نذیر احمد کے شاگرد ہیں اور اُن کی نثر پر مولوی صاحب کا گہرا اثر ہے - اگرچہ وہ اپنے استاد کی محاروں کی ٹھونسم ٹھانس کی عادت سے نالاں ہیں ، لیکن خود بھی محاوروں کے استعمال میں بے لگام نظر آتے ہیں - کیونہ ہو دلّی کے روڑے ہیں - سادگی اور سلاست بھی دلّی والوں کی سی ہے لیکن یہ مضمون اُن کے دوسرے مضامین سے قدرے مختلف ہے ، کیونکہ اس میں سادگی کے ساتھ ساتھ تخیّل کی کارفرمائیاں بھی ہیں کہ مضمون کا تمثیلی انداز اس کا متقاضی تھا - تخیل کے عنصر نے فرحت اللہ بیگ کے اس مضمون کو رپورتاژ کے قریب تر کر دیا ہے - البتہ محمد حسین آزاد جیسی رومانیت بھی نہیں اور اسلوب کی سادگی آخر تک برقرار رہتی ہے - مضمون کا یہ آخری اقتباس ہماری بات کی تائید کے لیے کافی ہے -

" آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی اللہ اکبر ، اللہ اکبر ، اللہ اکبر ، اللہ اکبر - اس کے ساتھ ہی سب کے مُنہ سے نکلا ' تری آواز مکّے اور مدینے ۔ اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اٹھائے - دُعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا ، صاحبو ، کچھ عجیب اتفاق ہے - فاتحہ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا ، اور اب فاتحۂ خیر پر ہی ختم ہوتا ہے - یہ کہہ کر اُنھوں نے دونوں شمعوں کو جو چکر کھا کر اُن کے سامنے آ گئی تھیں ، بجھا دیا - شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی ــ

حضرات مشاعرہ ختم ہوتا ہے "۔ ۲۴ء

مشاعرے کے اختتام کے ساتھ ہی جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تہذیب کے ایک باب کا بھی خاتمہ ہوتا ہے ــــــــــ

۲۳ء ایضاً ص : ۶۳ - ۶۴

۲۴ء ایضاً ص : ۹۹